ڈاکٹر عبدالکریم خالد کا حاسۂ تنقید

ڈاکٹر محمد امجد عابد

Dr. Muhammad Amjad Abid

Lecturer, Department of Urdu,

University of Eduation, Lahore

Abstract:

Dr. Abdul Karim Khalid is a prominent critic, a renowned poet, a journalist and an educationist of this era. As a critic, he has a keen interest and awareness of social problems, issues and contemporary affairs. By keeping insight the circumstances and background of the situation, the event captures his interest. His works of criticism reflects the wave of purposefulness which demonstrates the contemporary collective consciousness. This article throughs light upon the diverse aspects of the critical acumen of Dr. Abdul Karim Khalid from various angles and different approaches.

ڈاکٹر عبدالکریم خالد (١٩٥٢ء) اُردو شعر و ادب میں ایک ممتاز مقام کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ تحقیق و تنقید کے میدان میں بھی اپنا ایک منفرد حوالہ بھی رکھتے ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کے دو مجموعے ''نئے پرانے مضامین'' (١٩٩٨ء) اور ''چند اور مضامین'' (٢٠٠٨ء) زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ ان کی شاعری کا مجموعہ ''ہم اگر خواب ہوتے'' (٢٠١٧ء) بھی منظرِ عام پر آ چکا ہے۔ اس کے علاوہ اخبارات اور رسائل میں ان کے بے شمار تحقیقی و تنقیدی مضامین شائع ہو کر صاحبانِ علم و دانش سے دادِ تحسین پا چکے ہیں۔ عربی اور فارسی ہر دو زبانوں سے خصوصی شغف کے طفیل ان کے ہاں اگرچہ قدیم ادب اور خصوصاً ادبِ عالیہ سے گہری دلچسپی الگ سے ایک تنقیدی زاویہ نگاہ نمایاں کرتی ہے۔ تاہم عصری ادب کے حوالے سے ان کے تجزیاتی اور تخلیقی نثر پارے بھی بڑے واضح انداز میں اپنا جہانِ معانی کھولتے ہیں۔ آپ اپنے مشاہدے اور مطالعے سے اپنے عصرِ رواں کے معاملات، مسائل، مشکلات اور امکانات کو بھی اپنے مجاہدے کا حصہ بناتے ہوئے ادبیات کے ان ذہین قارئین کے سامنے امکانات اور ممکنات کے پیش منظر میں انسانی فہم و شعور کی ایسی صورت گری بھی کرتے ہیں جس سے ہمارا پورا عصر

اپنی شعوری پیش رفت کے ساتھ سامنے آ جاتا ہے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ڈاکٹر عبدالکریم خالد کے ہاں تنقید میں جو ایک جہانِ معانی کی تلاش کا ذکر کیا ہے وہ تلاش دراصل وہ امکانات ہیں جو انھوں نے اُردو ادب کی ہر مروجہ صنفِ سخن پر بات کرتے ہوئے پیش کیے ہیں اور ان امکانات کو اپنے امکانی تخلیقی وجود کا ہم رشتہ بنا کر انھیں اُردو ادب کا سرمایہ افتخار بنایا ہے۔ اسی بنا پر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کہتے ہیں:

> ''ڈاکٹر عبدالکریم خالد ایک بالغ نظر نقاد ہیں۔ ان کی تنقید کے پیچھے ربع صدی کا مطالعہ، برسوں کی تحریری ریاضت، اجداد کی ذہانت اور کاوش پیہم کا ہاتھ ہے۔ وہ تنقید میں جہانِ نو کے متلاشی رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک ایسا دستِ ہنر دیا ہے کہ وہ اپنی تنقیدی تحریر کے ذریعے قاری کو ایک ایسے جہانِ طلسمات میں لے جاتے ہیں جہاں وہ حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔''(۱)

ڈاکٹر عبدالکریم خالد کی تنقید میں سلاست و روانی کا عنصر بڑی جامعیت کے ساتھ موجود ہے۔ گراں بار الفاظ کے بوجھ تلے دم توڑتی ذہانت کی بجائے ان کے ہاں پورے ابلاغ کے حامل سادہ اسلوب کی ایسی پیش کش موجود ہوتی ہے جس کو پڑھتے ہوئے کوئی ابہام درپیش نہیں ہوتا، نہ کوئی الجھاؤ اور نہ ہی پیچ وخم۔ پختہ کاری، موضوع پہ گرفت اور جامعیت ان کے اسلوب کی اہم خصوصیات ہیں جو ان کی تنقیدی، تحقیقی اور علمی دریافت کی دلیل ہے۔ ڈاکٹر عبدالکریم خالد کے ہاں تنقید جس قدر متوازن ہے اسی قدر اس میں ان کا تخلیقی وجود اپنی پوری آئینہ داری کی طرح نقد کے زاویوں کے خدوخال ابھارتا نظر آتا ہے۔ لفظ بڑے قرینے اور سلیقے سے اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنے جذبۂ تخیل کو کام میں لاتے ہوئے نہایت بصیرت و بصارت کے ساتھ ان مقامات و منازل سے بڑی کامیابی کے ساتھ گزرتے ہیں جو ایک تخلیق کار کو کسی فن پارے کی تشکیل میں درپیش ہوتی ہیں۔ وہ ایسے تخلیق کار ہیں جنھوں نے تنقید لکھی مگر اپنی تخلیقی صلاحیت کو کہیں بھی دبنے نہیں دیا۔ اپنی روایت سے مسلسل جڑے ہونے اور اس کے احترام کا کامل رویہ ڈاکٹر عبدالکریم خالد کی ذات میں بڑا نمایاں ہے۔ تحقیق وتنقید کی روایت میں اپنے پیش روؤں سے اکتساب اور اس کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے ہاں جس طرح کا عجز وانکسار دکھائی دیتا ہے عموماً ہمارے یہاں یہ رویہ مفقود ہے۔ وہ اپنے اساتذہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی فنی بصیرت، عظمت اور اس سے حاصل کردہ تنقیدی روشنی کا جس طرح اقرار کرتے ہیں اس سے ہمیں ان کے باطن میں جھانکتی اس محبت کی سچی خوشبو سے آشنائی ہوتی ہے جو ان کے دل میں کھل کر گلاب بن چکی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے مختلف اصناف سخن کو اپنے ناقدانہ انداز نظر سے دیکھا اور ایک گہری تجزیاتی ریاضت کے بعد اپنے مطالعے کے نتائج سے اپنے ادبی قارئین کو روشناس کرایا۔ جیسے فن خاکہ نگاری کو

حوالہ بناتے ہوئے انھوں نے معاصر عہد کے ایک معروف شاعر اور خاکہ نگار احمد عقیل روبی کی خاکہ نگاری پر اپنا تجزیاتی مضمون پیش کیا۔ان کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے جدید نثر نگاروں سے یہ بجا طور پر شکوہ کیا ہے کہ وہ اپنی روایت سے اس لیے ناواقف ہیں کہ وہ صرف انگریزی پڑھتے ہیں اور اُردو میں لکھتے ہیں۔ان کے نزدیک:

> ''ہمارے ہاں برسات کی کھمبیوں کی طرح ایسے نثر نگار اُگ آئے ہیں جو لفظوں کا مجمع لگا کر خیال کی ڈگڈگی بجاتے اور خود ساختہ ترکیبوں اور آڑے ترچھے جملوں کے بندر نچا کر اپنی چادر بچھا دیتے ہیں۔وہ اپنی جن تحریروں پر لوگوں کو ہنسانا چاہتے ہیں ان پر رونا آتا ہے اور جن پر رلانا چاہتے ہیں انھیں پڑھ کر ہنسی کا فوارہ چھوٹ جاتا ہے۔''(۲)

ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے خاکہ نگاری کے نام پر محض لفظوں کی طوطا مینا بنانے والے نثر نگاروں کو کیسی بلیغ تنک نظری سے کاٹ دی ہے۔انھوں نے اپنے مضمون ''ایک باشعور تخلیقی نقاد۔عقیل احمد روبی''،میں احمد عقیل روبی کی زمین سے تعلق کی گہری وابستگی کو سراہتے ہوئے یہ بجا طور پر کہا ہے کہ وہ (احمد عقیل روبی) آسمان کی نہیں زمین کی باتیں کرتا ہے۔زمین اور زمینی عناصر کے ساتھ اس کا یہ تعلق اس کی ماں کا رہینِ احسان ہے وہ اس زمین کی مٹی کو خوب پہچانتا ہے۔اس کی خوشبو کا بھی ادراک رکھتا ہے اور مٹی سے بنی ہوئی ہر شے پر حق جتاتا ہے۔ڈاکٹر صاحب کی ایسی رائے کے باطن میں ان کا نظریہ فن بھی جھلکتا ہے کہ تخلیق کار کو جہاں عالمی سطح پر بدلتے ہوئے تناظر پر نظر رکھنی چاہیے وہاں اپنی زمین اور اپنی مٹی سے تعلقِ خاطر کو بھی نہیں بھولنا چاہیے کیونکہ انسان جس تہذیبی روایت میں پروان چڑھتا ہے، اس کا تاثر و تاثیر اس کے خمیر میں شامل ہوتا ہے اور وہ جس طرح کے ماحولیاتی اور زمینی حقائق سے نبرد آزما ہوتا ہے اس کا سماجی شعور اس کے عصری میلانات سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے اس حقیقت پسندانہ نظریاتی میلانِ نظر کو پروان چڑھانے میں مدد دیتا ہے جو اس کے عہد کا خاصہ ہوتے ہیں۔یہ انفرادی ذہنی رویوں کی بازیافت اس اجتماعی عصری شعور میں آگے چل کر ڈھل جاتی ہے جو کسی عہد کی بنیادی آواز کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔وہ ادبی اور تہذیبی روایات کی نمو میں شامل اس طرزِ احساس کی نمائندگی کرتے ہیں جو بیسویں صدی سے آغاز کر کے لمحۂ موجود تک آتے ہوئے ہمارے ماضی اور حال کی کہانی کا تانا بانا بنتے ہیں۔ان کی اس نوع کی تحریروں میں ہمیں کہیں بھی کوئی فکری ابہام نہیں ملتا کیونکہ ان کا اندازِ نظر ٹھوس شواہد اور زندہ تاریخی شعور سے عبارت ہے وہ حقیقتِ حال کو معاشرتی خدوخال میں رکھ کر دیکھتے ہیں اور پھر کسی صورت حال کو واقعے کی بنیاد بنا کر اسے اپنی تخلیقی تنقید کا محور بناتے ہیں۔ان کی تنقیدی تحریریں مقصدیت کی ایک ایسی لہر کو نمایاں کرتی ہیں جس میں ہمارے عصر کا اجتماعی شعور جھلکتا ہے۔ان کا روزنِ خیال ادب برائے ادب کی بجائے ادب برائے زندگی کے در کھولتا ہوا تخلیقی اظہار کے نئے جہانِ معنی

سے ہمیں روشناس کرواتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ان کی تنقیدی اور تحقیقی معروضات کے سرے ایک حقیقت پسند نقاد کے طور پر نمایاں ہو کر ہم سے داد طلب کرتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالکریم خالد کے نزدیک شاعری کو پرانے معیارات سے نئے معیارات میں ڈھلتے دیکھنے کا عمل، ایک پورے شعوری دور کی آمد اور اس سے انسانی بالیدگی کے نئے عناصر کا ظہور ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون ''حبیب جونپوری۔ ایک مطالعہ'' میں بیسویں صدی کی غزل کے نقوش میں نئے دور کی تشکیل اور تکمیل کو جس طرح سے دیکھا اور سمجھا ہے وہ ان کے خلاقانہ ذہن اور باریک حقیقتوں کی تہہ میں اتر کر گوہر آبدار کو برآمد کرنے کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ روحِ عصر کو کس طرح دیکھتے اور بیسویں صدی کی غزل میں اس کے برتاؤ کو کیسے سمجھتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

> ''اس دور میں نئے سرے سے شاعری کا مفہوم متعین ہوا اور اسے محض دل بہلاوے کی شے سمجھنے کے بجائے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے ایک مفید ذریعہ تسلیم کیا گیا۔ ''اعلیٰ مقاصد'' سے مراد یقیناً وہ خواب تھے جو سماج کو بدلنے کی زبردست خواہش کی صورت میں اس دور کے شعرا دیکھ رہے تھے۔ قوم کی سماجی اور معاشی زبوں حالی کو ختم کرنے، رہن سہن کے انداز بدلنے، معاشرت کے طور طریقوں کی درستی اور خوب سے خوب تر کی جستجو نے شاعری کے پرانے معیارات کو بدل کے رکھ دیا اور شعرا نے فنی اور سماجی شعور سے بہرہ ور ہو کر اردو شاعری کو نئے رجحانات سے روشناس کرایا۔'' (٣)

ڈاکٹر صاحب کے ہاں عصری شعور کی کارفرمائی اور ہمارے شعرا کی ذہنی خواہش کا مطالعہ بڑی وسعت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ انھوں نے جہاں تنقیدی زاویوں سے مختلف شعرا کے کلام کا جائزہ لیا اور ان کے مقام و مرتبے کا تعین بھی کیا اور وہیں انھوں نے ان کے پورے عہد کا تجزیہ کیا۔ ایک نقاد میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں اور انھیں کن تنقیدی معیارات پر پورا اترنا چاہیے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر عبدالکریم خالد لکھتے ہیں:

> ''ایک نقاد کے لیے صاحبِ فکر ہونا اتنا ہی ضروری ہے، جتنا آدمی کے لیے انسان ہونا۔ آدمی میں انسان ڈھونڈنے نکلیں تو اکثر مایوسی ہوتی ہے۔ نقادوں میں صاحبِ فکر کی تلاش کے لیے بہت جتن کرنا پڑتے ہیں اور اکثر و بیشتر یہ محنت رائیگاں ہی جاتی ہے۔'' (٤)

درج بالا اقتباس میں ڈاکٹر صاحب نے تنقید اور ناقدین کی موجودہ صورتحال کی بالکل درست نشاندہی کی ہے۔ وہ اُردو نقادوں کی سہل نگاری کا بھی تجزیہ کرتے ہیں ''یہ تو پُل صراط پر چلنے کا عمل ہے ایک آگ کا دریا ہے جس میں ڈوب کر پار اترنا ہے لیکن اُردو تنقید نگاری کی سہل نگاری نے تخلیقی ذہن

سے اعتماد چھین لیا ہے جو اسے پنپنے اور پروان چڑھنے میں مدد دیتا ہے اور پورے پاؤں زمین پہ کھڑا کرتا ہے۔ تنقید کا کام محض قصیدے پڑھنا یا خامیوں کا گنوانا نہیں بلکہ یہ سمجھنے، سمجھانے اور جاننے کا عمل ہے۔ تخلیق کار اپنی تخلیق کے لیے جن مشقتوں اور صعوبتوں سے گزرتا ہے نقاد اگر ان سے پہلوتہی کرے گا تو وہ نہ تخلیق کو سمجھ پائے گا اور نہ اس کے اندر چھپے ہوئے امکانات کو دریافت کر سکے گا۔"(۵) ڈاکٹر صاحب کے مطالعات کی روشنی میں جب ہم عصرِ رواں اور اس کے تناظر میں ہونے والی تبدیلیوں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اکیسویں صدی اور اس کی معروضی صورتحال پہ گہری نظر رکھتے ہیں جو ان کے عصری شعور کی گہری دلیل ہے۔ اس تناظر میں وہ تخلیق کاروں کی تخلیقات کا جائزہ بھی لیتے ہیں، ان کا تجزیہ کرتے ہیں اور موجودہ دور کے انسانی المیوں اور ان کے انسانیت پر اثرات کو رقم بھی کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> "اکیسویں صدی کا آغاز ابھی کل کی بات لگتی ہے۔ مگر اس کل کی بات پہ بھی بارہ برس بیت چکے ہیں۔ ان دس برسوں میں کیا کچھ نہیں ہوا۔ پاکستان کے اندر اور عالمی سطح پر جو خونی حادثات رونما ہوئے ہیں انھیں بیان کرتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ تاریک راہوں میں مارے جانے والوں کی دکھ بھری کہانیاں بیان کرنے کا یارا نہیں۔ عراق اور افغانستان پہ فوج کشی، ڈرون حملے، دہشت گردی، معصوم انسانوں کا قتل عالمی بساط پہ امریکی چالوں کے مختلف مظاہر بھی کمزور ملکوں کو اپنا باج گزار بنانے اور وہاں کے عوام پر عرصہ حیات تنگ کرنے کے لیے ہتھکنڈے، انسانی حقوق کے دعوے داروں کا اصل چہرہ دکھاتے ہیں۔"(٦)

درج بالا اقتباس ڈاکٹر عبدالکریم خالد کے عصری شعور کا غماز ہے۔ جب وہ دنیا میں مسلمانوں پر ظلم وستم کی انتہا دیکھتے ہیں تو ان کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ جب کوئی ایسی خبر نہ ملے جو اعصاب شکن نہ ہو۔ ہر صاحبِ دل ایک دردناک اذیت کے ساتھ زندگی کے دن گزار رہا ہے۔ عام آدمی زندگی کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لیے مارا مارا پھر رہا ہے۔ افراتفری اور انتشار کی عجب صورت حال ہے کہ ہر شخص اپنی مرضی کا مالک بنا ہوا ہے۔ جو مَن میں آئے کیے جا رہا ہے۔ ایسی ہی صورت حال ہمارے اداروں کی ہے۔ ملک کی سیاسی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالکریم خالد لکھتے ہیں:

> "سیاست کسی طوائف کی طرح تماش بینوں میں گھری ہوئی اپنی لٹی آبرو پر ماتم کر رہی ہو۔ جمہوریت ننگے سر سڑکوں پر رسوا اور تھانے کچہریوں میں ذلیل ہو رہی ہو تو ایک حساس فرد خودکشی کے علاوہ اور کیا سوچ سکتا ہے۔ خودکشی، زہر

پھانک کر یا چھت کے پنکھے سے جھول کر مر جانے کا نام ہی نہیں ہے، خودکشی یہ بھی ہے کہ ہم دم سادھ کر حیرت کی تصویر بن جائیں اور وہ لوگ جن کے ظلم و ستم کی رسی دراز سے دراز ہوتی جا رہی ہے۔ (وہ) ضابطوں، اصولوں اور قوانین کی پیٹھ پر کوڑے برساتے رہیں اور یوں ایک فرد نہیں بلکہ پوری قوم کی قوم موت کے دھانے کی طرف کھسکتی چلی جائے۔''(۷)

مندرجہ بالا اقتباس عصرِ حاضر کی مکمل تصویر کشی کر رہا ہے۔ ہماری سیاست، معیشت، معاشرت سب کے سب عجب سمت جا رہے ہیں۔عوام کو انصاف دلانے والوں کو خود انصاف نہیں مل رہا۔ایک عجیب صورت حال ہے۔ ایسی صورت حال میں ادیب کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ادب کے ذریعے مجموعی صورت حال کا درست انداز میں جائزہ لے اور اپنی تحریروں کی مدد سے معاشرے کی اصلاح کا فریضہ سرانجام دے۔ کیونکہ ادب زندگی کا ناقد ہے۔مگر ادب اور ادیب کا یہ المیہ ہے کہ جو کام انہیں سر انجام دینے چاہئیں وہ بھی اپنی ذمہ داریوں سے کما حقہ عہدہ برآ نہیں ہو رہے۔ان کی حالت زار کا نقشہ ڈاکٹر عبدالکریم خالد نے کچھ اس انداز سے کھینچا ہے:

''شاعروں کے شعروں میں نرم روی اور گلوں کی تازگی کی بجائے تلخی اور زہرناکی اُتر آئی ہے۔اس کی انا کے ڈنگ کچھ زیادہ ہی تیز ہو گئے ہیں۔تخلیق کار ایک عام آدمی کی سطح پر اُتر کر آوازے اور پھبتیاں کستا ہے......افسانہ نگار محض افسانے تراشتے اور فن کے نام پر حقیقت کا گلہ گھونٹتا نظر آتا ہے۔ادیب، ادب لکھتا ہے اور آدابِ زندگی شائد بھول گیا ہے...... ہر کوئی دوسرے کو دھوکا دینے اور نیچا دکھانے میں مصروف ہے جس میں ہمارا ادیب بھی شامل ہو گیا ہے۔''(۸)

ڈاکٹر عبدالکریم خالد کے نزدیک عصر حاضر میں ایسے تخلیق کاروں کی کمی بے حد محسوس کی جا رہی ہے جو سنجیدگی سے علم و ادب کا فریضہ سرانجام دیں اور اس کی آبیاری کریں۔ کیونکہ ادیب زمانے کے رسوم و رواج سے الگ ہوتا ہے۔ وہ معاشرے میں رہ کر بھی اپنی تنہائی کا اسیر ہوتا ہے اور اس کا لکھا ہوا نوشتۂ دیوار ہوتا ہے۔ یہ دنیا جغرافیائی اعتبار سے تو شائد گلوبل ویلج بن گئی ہو مگر فکری سطح پر تخلیق کاروں میں آج بھی بعد المشرقین موجود ہے۔جغرافیائی ہم آہنگی وقت کی ایک اہم ضرورت ہے مگر اس سے بھی زیادہ ضروری فکری ہم آہنگی ہے۔ یہ کام سائنس اور ٹیکنالوجی نہیں بلکہ سنجیدہ فکر ادب اور ادیب ہی کر سکتے ہیں۔تخلیق کاروں میں سنجیدگی کے مفقود ہونے کی ایک بڑی وجہ شائد یہ بھی ہے کہ ادیب، ادب اور قاری کی مثلث ٹوٹ چکی ہے۔ادب زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں، ادیب کا قلم احباب کی خوشنودی کے لیے وقف ہو گیا ہے۔تخلیق کار حرف معتبر لکھنے اور دلیل آزمانے کی بجائے لٹھ بازی اور تلوار زنی میں مستعد ہے۔اور قاری نے اس ادب کش صورت حال میں ادبی تخلیقات سے ناتا توڑ لیا ہے۔ضرورت

اس امر کی ہے کہ عہدِ حاضر میں ادب، ادیب اور قاری کی مثلث کو یکجا کیا جائے۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب ادیبوں کے لفظ صامت اور گنگ نہ رہیں۔ اور وہ اپنی ذات کے خول سے باہر نکلیں۔ اپنے منصب کا ادراک کریں اور خود کو اس اجتماعی دھارے میں شامل کریں جس کے رواں دواں رہنے میں وطن کی عافیت اور قوم کی بقا ہے۔

بنیادی طور پر ڈاکٹر صاحب ایک استاد ہیں۔ انھیں اپنی قومی زبان سے بہت محبت ہے۔ مگر ملک میں رائج انگریزی زبان اور اس کے اثرات کو دیکھتے ہیں تو وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہم سب کہاں جا رہے ہیں۔ کسی بند گلی میں یا کسی ایسی سمت جہاں ہم انتشار کا شکار ہو کر ایک قوم بننے کی بجائے ایک منتشر گروہ بن جائیں گے۔ یہی سوالیہ انداز ان کے عصری شعور کا پتہ دیتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''بہت پہلے انگریزی کو رائج کرنے کا ایک مقصد مغلوں کے اقتدار کے طلسم کو ضائع کر کے رعایا کے دلوں کو ان کے نئے حاکموں کی جانب مائل کرنا تھا۔ آج ہم یہی کام سرانجام دے کر کس نظام کے طلسم کو زائل کرنا چاہتے ہیں اور لوگوں کے دلوں کو کن نئے حاکموں کی جانب مائل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کونسے ارادے ہیں جن کے بیج بوئے جا رہے ہیں اور وہ کونسی فصل ہے جسے حاصل کرنے کے خواب دیکھے جا رہے ہیں۔ کشتِ جاں میں سنگ بو کر فصل گُل کی آرزو رکھنے والے ہم کیسے لوگ ہیں؟ ہم کون ہیں؟ ہماری پہچان کیا ہے؟''(۹)

ڈاکٹر صاحب ملک کے اندر اپنی زبان کا تحفظ اور اس کی بقا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہم آج تک لارڈ میکالے کی افتادِ طبع اور اس ذہنی تعصب کا شکار ہیں جو وہ مشرقی زبانوں اور علوم کے بارے میں رکھتا تھا۔ الغرض جب ہم علامہ موصوف کے مختلف رسائل میں بکھرے متنوع مضامین کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے یہاں عصری شعور کا برملا اظہار ملتا ہے۔ ہم ان مضامین میں تحسین و تردید یا حسن و خوبی کے استعاروں کو ہی نہیں دیکھتے بلکہ ہمیں ان مضامین کے پس منظر میں ایسے روشن خیال نقاد کی تنقیدی بصیرت کے جہان ملتے ہیں جو ہمارے عصری رویوں کی پوری غمازی بھی کر رہے ہیں اور آنے والے کل کے روشن چہرے کو اجالنے میں بھی اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ شبیہ الحسن، سید، ڈاکٹر، فلیپ: چند اور مضامین، از ڈاکٹر عبد الکریم خالد، لاہور: آئی جے ایف پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء

۲۔ عبد الکریم خالد، ڈاکٹر، نئے پرانے مضامین، لاہور: اظہار سنز، ۱۹۹۸ء، ص:۵۳

۳۔ ایضاً، ص:۳۹

۴۔ ایضاً، ص:٦۹

۵۔ ایضاً،ص:۱۷

٦۔ عبدالکریم خالد، ڈاکٹر، فیض اور اکیسویں صدی کا منظر نامہ، مضمون مشمولہ: معیار، شمارہ ۹، اسلام آباد: بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، ۲۰۱۳ء، ص:۴۸۴

۷۔ عبدالکریم خالد، ڈاکٹر، ادب کا المیہ، مضمون مشمولہ: نئی بات، روزنامہ، لاہور: ۷ مئی ۲۰۱۲ء، ص:۹

۸۔ ایضاً، ص:۹

۹۔ عبدالکریم خالد، ڈاکٹر، اردو زبان' مسائل اور امکانات، مضمون مشمولہ: سیپ، شمارہ ۸۰، کراچی: سیپ پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص:۱۰۔۲۰۹

☆......☆......☆